احمد مشتاق کی شاعری میں عصری حسّیت

Contemporary Conciousness in Ahmad Mushtaq's Poetry

طاہرہ صدیقہ

محمد نوید

Abstract:

Ahmad Mushtaq is one of the Modern Leading and reputed Pakistani Poets who is well known for his unique Poetic style. He has Neo classical tone and has no commitmental poetry. This research paper highlights the refinement / cultural values, collectiveness and ecological aspects in his poetry . According to Ahmad Mushtaq, along with poetry, knowledge of music and other fine arts should also be accessible. He created a transparent style in modern Urdu ghazal. In which one gets a glimpse of the experts who make small pictures. Deep thoughts and philosophical elements are less in his poetry. He is a poet of mixed emotions.

احمد مشتاق عصرِ حاضرع کے جدید غزل گو شعرا میں سب سے اہم اور خوب صورت شاعر ہیں۔ ناصر کاظمی سے انسیت اور اثرات قبولنے کے باعث ان کی شاعری حسی اور جمالیاتی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری بنیادی طور پر محسوسات کی شاعری ہے۔ اُن کی شاعری کی نسبت میر تقی میر، ناصر کاظمی اور فراق گورکھپوری سے ملتی ہے۔ فراق اور ناصر کاظمی کی طرح احمد مشتاق بھی اپنے معاصر شعرا کے ہجوم میں تنہا اور ایک خاص انفرادیت کے حامل ہیں۔ احمد مشتاق نے بھی ان دونوں شعرا کی مانند اپنی روایت سے اکتساب کے حوالے سے شعروی انتخاب کارویہ برتا ہے۔

احمد مشتاق کے یہاں ناصر کاظمی کی مانند خاص لسانی شعور اور طرزِ احساس کا جادو بھرا تخلیقی تجربہ ملتا ہے جس کے باعث وہ دیگر غزل گو شعرا کے مقابلے میں زیادہ پُر اثر شاعری کا نمونہ پیش کرتے ہیں، جو دل سے

نکل کر دل پر اثر کرتا ہے۔ کسی بھی لفظ یا واقعے کو خواہ وہ عمومی ہی کیوں نہ ہو احادِ مشتاق اپنے مخصوص سحر طراز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ انوکھا اور منفرد محسوس ہوتا ہے۔

دُکھ کی چیخیں پیار کی سرگوشیاں رہ جائیں گی

ہم چلے جائیں گے آوازیں یہاں رہ جائیں گی[۱]

احمد مشتاق کی شاعری کا دھیما اور مترنم انداز انہی سے خاص ہے۔ ان کی شاعری کا جادو برابر کام کرتا ہے اور اس کا تاثر خوش بو کی طرح ہمارے محسوسات میں بس جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ چوں کہ وہ کسی مخصوص تحریک سے وابستہ نہیں رہے اس میں عصریت کا شعور ناپید ہے۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں ان کے اشعار میں باغیانہ اور احتجاجی کیفیت تو نہیں ملتی لیکن عصر حاضر کے مسائل کا ادراک ضرور ملتا ہے۔

سب کچھ بدل گیا ہے تہہ آسمان مگر

بادل وہی ہیں رنگ وہی آسماں کا ہے[۲]

احمد س مشتاق کی شاعری ہماری مختلف حسیات کے ساتھ مکالمہ قائم رکھتی ہے لہذا اس کا اثر بھی تادیر رہتا ہے۔ ان کی شاعری کی تشریح اور معنی مفہوم کی تلاش کے بجائے قاری اپنے آپ کو اس سحر انگیز شاعری کا اسیر محسوس کرتا ہے۔

سفر میں منزل و ماندگی بھی شامل ہے

اٹھا رہا ہوں مزے تھک کے بیٹھ جانے کے[۳]

دیرپا شاعری وقتی طور پر مقبول موضوعات یا اسالیب کو دہرائے جانے کا نام نہیں، سچی شاعری اپنے عصر اور دائمی احساسات کی بنیادی صداقتوں سے انفرادی رشتہ قائم کرنے اور اس کے اظہار کے لیے موزوں لہجہ تلاش کرنے کا ہنر ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کلیات احمد مشتاق کے فلیپ پر لکھتے ہیں: "احمد مشتاق کی غزل اپنی سطح پر احتیاط اور کاری گری کا نفیس مظہر ہے۔ ایسی نتھری اور سُتھری، دھیان کی جوت جگاتی شاعری عصرِ حاضر میں کم ہی شعرا کو نصیب ہوئی ہے" [۴]

شاعر کا دو طرفہ سفر، اپنے عہد کے آشوب کے بیان کے لیے بھی مناسب تمثالوں کا جھروٹ سامنے لاتا ہے اور اس داخلی سفر خوابوں اور متخیلہ کے بغیر بھی آباد کرتا ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری میں پت جھڑ کے موسم گلستان کو ملال و رنج تو دیتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے رنگ بستوں کے مٹے نشان، دروازے، زینے، برجیاں، دلان اور کمروں کے صحن میں اڑتی دھول پورا منظر سوگوار کر دیتا ہے۔ عرضکہ ایک چھوٹا سے جہان، سب سے الگ میر، فراق اور ناصر کاظمی سے بھی جن سے احمد مشتاق نے اپنے شاعرانہ لہجے کی تشکیل کے لیے گہرے اثرات لیے ہیں۔

احمد مشتاق کی غزل کا حُزنیہ ترنم، تاثرات کا وفور اور تمثالوں کی کسی غیر مانوس جہت کو دکھانے کی صلاحیت اُن کے لہجے کی شناخت کرائی ہے۔ جیسے کبھی آس،مان پر رنگ ٹھہرتے، تیرتے، گزرنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی احمد مشتاق کی غزل کے اُفق پر جذبات اور احساسات کے رنگوں کی بہپار دیدنی ہے۔ کہیں گیروا، کہیں سبز، کہیں چمپئی اور کہیں دھانی:

جاتے ہوئے ہر چیز یہیں چھوڑ گیا تھا

لوٹا ہوں تو اک دھوپ کا ٹکڑا نہیں ملتا[۵]

یہاں ان اشعار میں ایک طرح کے تحیر (sense of bewilderment) گھبراہٹ کا احساس ملتا ہے۔

احمد مشتاق کی شعری کارگاہ میں دو عناصر خصوصاً جاذب نظر ہیں ایک اُن کے یہاں خود تکلفی کا انداز اور دوسرا اناسٹلجیا (یاد آوری) کے عمل سے اُن کی رغبت اور اس کی جانب کشش قابلِ توجہ ہیں:

رات پچھلے پہر وہ ہوائیں چلیں بدلی رونے لگی، زخم گانے لگے

تیرے جانے کے دن، تیرے آنے کے دن یاد کی شاخ پر چہچہانے لگے[۶]

بس ایک دراز تر ہو جانے والا تاثر اس شعر سے سامنے آتا ہے اور ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ احمد مشتاق کی شاعری میں لہجے کی افسردگی اور داخلی سوز کی جو کیفیت ملتی ہے، اُس کا شاعر کی ذات اور اُس کی معصومیت سے گہرا تعلق ہے۔ اُس پر زمانے کے سرد و گرم کا جو بھی اثر پڑتا ہے وہ بالآخر زیاں کاری اور فنا پذیری کے احساس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں احمد مشتاق کی شاعری کی قوتِ مُحرکہ کا جائزہ لیا جائے تو نمایاں ترین محرک اور طاقت ور کردار ''وقت'' اور ''زمانہ'' ہیں۔ ان کرداروں کی نمائندگی وہ مختلف الفاظ سے کرتے ہیں۔ کبھی وقت کی نمائندگی موسم سے ہوتی ہے، کبھی دن اور رات کے الفاظ سے تو کبھی صبح و شام کے مناظر اس تبدیلی کا احساس دلاتے ہیں اور کبھی لمحہ، ساعت، مدت اور زمانہ جیسی لفظیات زمانی بالادستی کو نمایاں کرتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں وقت کوئی منجمد تصور نہیں لہذا جو کچھ بیت گیا اُس کی بازیافت ماضی حال

اور مستقبل کے موازے کی صورت میں زیادہ نمایاں ہے ۔ درج ذیل اشعار میں وقت اور زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے ہاتھوں احساسِ زیاں کی شدت کو جس طرح نمایاں کیا گیا ہے، اس سے بالادست وقت کے سامنے انسان کی عام ہزیمت کا احساس بہت شدید ہو جاتا ہے:

موسموں کا کوئی محرم ہو تو اس سے پوچھوں
کتنے پت جھڑ ابھی باقی ہیں بہار آنے میں ۷

احمد مشتاق کی شاعری میں فضا پذیری، احساسِ زیاں، اندوہ، افسردگی اور زوال کا ہر منظر وقت کی بالادستی اور زمانے کے دستبرد کا لازمی نتیجہ ہے۔ '' باغ کا باغ لہو رنگ ہوا جاتا ہے '' یہ شعر شاعر کے سماجی سروکار، عصری حسیت کو بھی ظاہر کرتا ہے اور ذات کے غم کو کائنات کے غم میں تبدیل کرنے کے رویے کی شہادت بھی دیتا ہے۔ اُن کے یہاں چوں کہ کائنات کی ہر چیز سے عشق اور محبت کے حوالے سے بیان ہوئی ہے، اس لیے گزرتی عمر اور زوال آمادہ حُسن شاعر کو اضمحال و افسردگی سے بھی گزارتا ہے اور حیرت و استعجاب سے بھی دوچار رکھتا ہے۔ وہ پوری دنیا کو اپنے دل کی طرح پاکیزہ، لطیف اور غیر آلودہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُنھیں کائنات کی ثقافت بھی عزیز ہے اور دل کی شفافیت بھی:

دھویں میں آسماں کا رنگ میلا ہوتا جاتا ہے
ہرے جنگل بدلتے جا رہے ہیں کارخانوں میں ۸

انتظار حسین نے '' گردِ مہتاب '' کے پیش لفظ میں احمد مشتاق کی شاعری کو کسی نظریہ حیات یا فلسفہ زندگی سے عاری بتایا ہے۔ کم و بیش اسی نوع کی رائے کا اظہار شمس الرحمن فاروقی نے ناصر کاظمی کی غزل کے حوالے سے کیا تھا مگر ان شعرا کے یہاں جس طرح کی افسردگی اور احساس زیاں کے رویے ملتے ہیں، ان میں ذات کے افسانے کے ساتھ عصری حسیت کے عناصر بھی موجود ہیں۔

احمد مشتاق کے شعر میں باغ کے باغ کے لہو رنگ ہونے میں بھی جس خون ریزی، تباہ کاری اور انتشار کا عندیہ صرف "لہو رنگ" کی ترکیب سے ملتا ہے، اس سے زیادہ اپنے عہد اور اپنی صورت حال سے بامعنی سروکار شعریت کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے ظاہر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کی چمن آرائی اپنے عصر کی غالب قوت کے جبر اور تلسط کے عمل کو طنزیہ اسلوب کی جس سطح مرتفع پر جا کر نمایاں کی اگیا ہے، اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ستم گزیدہ کوئی ہاو ہو کوئی فرہاد
جو یہ نہیں ہے تو مرتے رہو سسکتے رہو۹

نغمہ گو یہ تلخ نوائی کا وقت ہے
غُل ہی مچاو ساز اگر بولتے نہیں ۱۰

زندگی کی گڑی دھوپ میں عافیت اور اطمینان کی تلاش اور تاریک رات میں چنگاریوں سے روشنی پیدا کرنے کا عمل، منفی سماجی صورت حال میں زندگی کی سبلیں نکالنے کی صورتیں نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح ہاو وہوا اور تلخ نوائی کی تلقین، صدائے احتجاج اور جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے کا عمل ظاہر نہیں کرتی پھر اس کا جواز اور کیا ہو سکتا ہے۔

احمد مشتاق نے قدیم شعری علامات کو نئی معنویتوں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ فیض کی مانند انھوں نے بھی ان علامتوں سے دونوں طرح کے کام لیے۔ ایک تو قدیم علامات کے امکانات وسیع کیا اور دوسری جانب ان علامتوں میں بالکل نئی معنویت پیدا کی ہے۔ اس ضمن میں شہر کی علامت کو لیا جائے تو احمد مشتاق کا شعر دیکھیے:

سب پھول دروازوں میں تھے سب رنگ آوازوں میں تھے
اک شہر دیکھا تھا کبھی اس شہر کی کیا بات تھی ۱۱

"دیکھا تھا کبھی" اور "کیا بات تھی" کے فقروں میں جو حُزن و ملال کی کیفیت ہے، اس نے شعر کے تاثر میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ سب پھولوں کا دروازوں میں ہونا، خوشحال، بھرے پُرے اور خوشنما شہر کی علامت ہے۔

اس ساتھ ساتھ یہ ایک ایسے شہر کی بھی علامت ہے جس میں الگ الگ مسالک اور عقائد کے افراد موجود تھے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ ہم آمیز و ہم آہنگ تھے۔ اس ہم آمیزی و ہم آہنگی نے شہر کو اور بھی زیادہ مثالی بنا دیا تھا۔ "اس شہر کی کیا بات تھی" شاعر کا غم یہی ہے کہ دروازوں سے پھول اور آوازوں سے یہ رنگ اب معدوم ہو چکے ہیں۔

عصری معنویت کی روشنی میں اس شعر کے مفہوم پر غور کیا جائے تو عقیدوں اور مسالک کے اختلاف کے باعث بڑے شہروں میں جو انتشار اور منافرت پھیل رہی ہے، یہ شعر اس کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اس زمانہ میں سب پھولوں اور سب رنگوں کا اشتراک ممکن نہیں ہے۔

شہر کی رونق کے ختم ہونے کا سبب بھی دراصل یہی عدم اشتراک ہے۔ شہر کی علامت کے حوالے سے احمد مشتاق کے مزید اشعار ملاحظہ کیجیے:

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے ۱۲

صبح کی دیوار کے سائے میں تھک کر سو گئے
چاند جن کو شہر میں شب بھر لیے پھرتا رہا ۱۳

اس کے علاوہ صبح، چاند، شب اور دھوپ کی علامات بھی کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ دھوپ آلام و مصائب کی علامت ہے۔ دریا، صحرا اور سمندر کی علامتیں بھی احمد مشتاق کے یہاں موجود ہیں۔

ہم اپنے دکھ بھرے دل کی کہانی کہتے رہتے ہیں
ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں دریا بہتے رہتے ہیں ۱۴

یہاں دریا زرخیزی کی علامت ہے۔ یعنی پہلے یہاں خوشحالی تھی لیکن اب یہ چیزیں یہاں موجود نہیں ہیں۔ گھر اور اس کے متعلقات کے ذریعے احمد مشتاق نے گزرے ہوئے زمانوں کی یاد اور معدوم ہوتے ہوئے آثار کے ملال کا اظہار کیا ہے۔

چھوٹا سا ایک گھر تھا درختوں کی اوٹ میں
بام بلند و زینہ پیچاں نہ تھا کبھی ۱۵

احمد مشتاق نے اپنے اس شعر بام بلند اور زینہ پیچاں کے ذریعے جدید صنعتی تہذیب کی نمائندگی کی ہے جس نے قدیم تہذیب کو تبدیل کر دیا ہے۔ نئی تہذیب کے باعث انسان فطرت اور فطری نظام زندگی سے بھی محروم ہو چکا ہے۔ انیس اشفاق اپنے مضمون ''نمائندہ شاعر: مشتاق'' میں احمد مشتاق کی شاعری میں استعمال ہونے والی نمائندہ علامات کی مثالیں دے کر وضاحت کی ہے کہ انھوں نے ان علامات کو کس کس انداز میں استعمال کیا ہے:

"شاعر ان علامتوں کی نئی معنویتوں کو نمایاں کر رہا ہے اور ان کے امکانات میں وسعت پیدا کر رہا ہے۔ لیکن ان علامتوں میں کوئی علامت ایسی نہیں ہے جسے

شاعر کی نجی علامت قرار دیا جائے۔ اپنے پیش رو شعرا کی طرح احمد مشتاق بھی بعض الفاظ کی معنوی قوت سے واقف ہیں اور ان کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن وہ نئی علامتیں یا ان کے تلازمات وضع کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔"۱۶

احمد مشتاق کو آلودگی اور کثافت کسی حال میں قبول نہیں ہے۔ فطرت کے پاکیزہ اور شفاف ہونے کی وجہ سے ان کا رشتہ فطرت سے کافی گہرا ہے۔

دریا کی علامت اردو شاعری میں بہت بار استعمال ہوئی ہے احمد مشتاق کو ایک تو فطرت کا مظہر ہونے کے باعث دریا سے انسیت ہے دوسرا یہ وقت کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے۔

پہلے کے دور میں درختوں کا رنگ سبز اور آسمان کا رنگ نیلا ہوا کرتا تھا مگر آج دھول مٹی اور آلودگی کے باعث درخت مٹیالے اور آسمان زرد دکھائی دیتا ہے۔ احمد مشتاق کے ہاں عصر حاضر میں در آنے والے اہم مسئلے یعنی ماحولیاتی آلودگی کے بھی اشارات ملتے ہیں۔

سر اٹھاتے ہی کڑی دھوپ کی یلغار ہوئی
دو قدم بھی کسی دیوار کا سایہ نہ گیا۱۷

زندگی سے ایک دن موسم خفا ہو جائیں گے
رنگ گل اور بوئے گل دونوں جدا ہو جائیں گے ۱۸

احمد مشتاق کے تخلیقی رویوں کے پس منظر میں ان کے بدلے ہوئے طرزِ احساس نے بھی اپنے معاصرین کے درمیان اُن کی انفرادی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ عشق کے روایتی موضوع، عاشق اور معشوق کے معین کردہ کردار اور تہذیب عاشقی کے تسلسل میں احمد مشتاق کے لیے امتیاز کا باعث نئے عہد میں عاشق کا تبدیل شدہ طرز احساس ہے۔

احمد مشتاق کے ہاں عشق کا تصور دیگر شعرا کی نسبت بہت مختلف ہے کیونکہ اس معاملے میں وہ میر کی پیروی کرتے ہیں۔ میر تقی میر کے ہاں ان کے زمانہ اور تہذیب کے مطابق رسم عاشقی کا اظہار ملتا ہے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا۱۹

پاس ناموس عشق تھا ورنہ

کتنے آنسو پلک تک آئے تھے ۲۰

احمد مشتاق کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار میر تقی میر کی یاد آتی ہے۔ میر کا زمانہ ان کی تہذیب اور ان کے زمانہ میں عشق کے طور طریقے سب آج کے زمانہ سے یکسر مختلف تھے آج کے دور میں اس قدر تہذیب، نفاست اور رکھ رکھاو دکھائی نہیں دیتا۔ آج کے دور میں عشق اور عاشقی معنی و مفہوم تک بدل چکے ہیں لیکن احمد مشتاق نے اس حوالے اپنے ذاتی اور پسندید تصور عشق کو ہی اپنایا ہے۔

احمد مشتاق کے کلام میں عاشق کا کردار اپنے محبوب کے معاملے میں صوفیانہ رویوں کی حد تک راضی بہ رضا ہے۔ عشق اُس کے لیے تربیت گاہ بھی ہے اور تہذیب و شائستگی کا مظہر بھی ہے۔ اُس کے لیے معشوق کا ہر عمل تسلیم و رضا کا موجب ہے۔ اسی لیے وہ محبت کی تمام آزمائشوں کا احساس بھی رکھتا ہے اور ان کے لیے تیار بھی ہے:

تو نے ہی تو چاہ تھا کہ ملتا رہوں تجھ سے

تیری یہی مرضی ہے تو اچھا، نہیں ملتا ۲۱

مجھے معلوم ہے اہل وفا پر کیا گزرتی ہے

سمجھ کر سوچ کر تجھ سے محبت کر رہا ہوں میں ۲۲

عاشقی کی یہ تہذیب عاشق کے مفاہمتی رویے کے سبب نو کلاسیکی بھی ہے اور اپنے محبوب کی عزتِ نفس کے احتام کے اعتطار سے بالکل جدید بھی ہے۔ احمد مشتاق کی غزل میں عشق کی تہذیب کے عناصر اور آداب اُن کی ذات کے اپنے متعین کردہ ہیں۔ یہ تہذیب اپنے آپ میں ایک ایسی دنیا کے متبادل ہے جو التباس کی دنیا بھی ہو سکتی ہے مگر ان کی شاعری میں آ کر ایک ٹھوس، مستحکم اور قابلِ انحصار دنیا بنتی دکھائی دیتی ہے۔ اس معاملے میں میر تقی میر سے محبت کی یہ تہذیب احمد مشتاق نے اکتساب کی ہے۔

اردو غزل کا بنیادی موضوع محبت ہے احمد مشتاق نے اپنی غزل کے اشعار میں محبت کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

زبانوں پر الجھتے دوستوں کو کون سمجھائے

محبت کی زبان ممتاز ہے ساری زبانوں میں ۲۳؎

محبت ہے جہاں میں منبع حسن و توانائی

اسی قوت کے بل پر زندگی اشیا میں رہتی ہے ۲۴؎

احمد مشتاق کا تصور عشق اپنی جگہ مگر موجودہ زمانے کے حالات کے تناظر میں ایسے اشعار بھی کہتے ہیں جس میں آج کے دور کے عشاق کا تصور عشق ملتا ہے۔ جیسا کہ

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ ہوا یہ رات

اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے ۲۵؎

تیری نظروں نے یہ بات اب مجھے سمجھائی ہے

کل محبت تھی ہوس آج کی سچائی ہے ۲۶؎

احمد مشتاق کے تصور عشق میر تقی میری کی مانند جو تہذیبِ رسم عاشقی ملتی ہے۔ اس کے تحت ایک مدت تک وہ محبوب کو دیکھتے اور اسے چاہتے رہے مگر جب وہ پاس سے گزرا تو بلایا نہ گیا۔ اسی طرح ان کا ایک شعر ان کے تصور عشق خوبصورت اظہار ہے

اس لیے حال دل نہیں کہتا

کہیں جذبات میں نہ بہہ جاوں ۲۷؎

ضیا الحسن احمد مشتاق کو ایک مختلف رومانوی شاعر قرار دیتے ہوئے ان کی شعری تخلیقیت کے حوالے رقمطراز ہیں:

> "احمد مشتاق فراق کی روایت شعر کے شاعر ہیں، ان کی شاعری میں رومانوی حظ نمایاں جو اپنی جگہ بہت قابل قدر ہے اور زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ احمد مشتاق بہت اچھے، بہت دلربا شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی قرات ہمیں ایسے خوبصورت اور تخلیقی ماحول میں لے جاتی ہے جو ہمیں کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن اس میکانکی زندگی سے محفوظ کرتی ہے" ۲۸؎

احمد مشتاق کا شعری تجربہ اپنے معاصرین سے بہت مختلف ہے اور اک الگ ذائقے اور خوبصورتی سے آشنا کرتا ہے۔

احمد مشتاق کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے تصور محبت کے حوالے سے دیگر معاملات کو بھی دیکھتے ہیں جیسا کہ عہد حاضر میں انسانی ذہن کی نارسائی، تمناوں کے ناتمام رہ جانے اور خوابوں کے ٹوٹ جانے کے حوالے:

میں تجھے بھول نہ جاتا تو خزاں ہی رہتی

شاخ پر پھول تیری یاد دلانے آیا[۲۹]

مطمئن تو خیر کیا ہوں گے مگر نادم نہیں

دل میں جب تک آگ تھی ہم روشنی کرتے رہے[۳۰]

احمد مشتاق کی شاعری میں ہجرت کا کرب گرزے ہوئے عہد کی یادیں، شہروں کی ویرانیاں، سناٹے، عشق کی آفاقیت اور خوبصورتیاں ایک سلیقے اور تہذیب کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ اُن کے ہاں دیار غیر میں مسائل، یادماضی، زمانے کی ناقدری، شناخت کے مسلے، بے وطنی کی تلخیاں اور ان جیسی بے شمار کیفیات کی عکاسی روایت انداز میں نہیں ملتی۔ ان کی شاعری میں دریا، صحرا، سفر، سناٹا، آسمان اور دھواں استعاراتی انداز میں ہجرت کی واردات کے مظہر ہیں۔

چونکہ احمد مشتاق عرصہ دراز سے دیار غیر میں مقیم ہیں لہذا وہاں کے مسائل سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ لیکن انہیں غریب الوطنی میں زندگی گزارنا مشکل لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کے لیے یہاں کے حالات ساز گار نہیں ہیں۔

احمد مشتاق پردیس میں پریوں کی تلاش میں نکلے اور پھر واپس وطن لوٹ نہ سکے۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی اداسیوں، تنہائیوں، دکھوں اور بے پناہ سوچوں اور تفکرات کے ساتھ بنا کسی قافلے یا احباب کے جھرمٹ کے خود ہی تنہا سفر کیا۔ ان کے ہاں کوئی مخصوص قسم کا جیسے حب الوطنی یا ناسٹلجیا کا نظریہ نہیں ملتا اس کے باوجود وطن سے محبت، در و دیوار، یہاں کے دریا، پھول، درخت، بہار، خزاں، گلشن اور بستیاں یہاں تک کہ خالی مکان، دلان اور ان کے سناٹے بھی ان کی شاعری میں یادوں کے سرمائے کے طور پر موجود ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ احمد مشتاق، اوراقِ خزانی، انڈیا: ریختہ فاونڈیشن، ۲۰۱۵، ص:۴۱

۲۔ احمد مشتاق، کلیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹، ص:۲۲۶

۳۔ ایضا۔۔ ایضا۔۔۔ ایضا، ص:۲۸

۴۔ سہیل احمد خان، فلیپ، مشمولہ؛ کلیات احمد مشتاق، ایضاً، ص: فلیپ

۵۔ احمد مشتاق، کلیات، ۔۔۔۔ ایضاً، ص:۱۲۳

۶۔ ایضا، ص:، ص:۱۶۵

۷۔ ایضا، ص: ص:۱۵۴

۸۔ ایضا، ص: ص:۱۳۷

۹۔ ایضا، ص: ص:۱۰۲

۱۰۔ احمد مشتاق، اوراقِ خزانی، ص:۳۱

۱۱۔ احمد مشتاق، کلیات، ص:۴۷

۱۲۔ ایضا، ص: ص:۹۱

۱۳۔ ایضا، ص: ص:۹۰

۱۴۔ ایضا، ص: ص: ۱۸۱

۱۵۔ ایضا، ص: ص: ۲۷۲

۱۶۔ انیس اشفاق، "نمائندہ شاعر: احمد مشتاق"، مشمولہ؛ آدمی ہمارا (شعریات احمد مشتاق)، مرتبہ؛ مشتاق احمد، لاہور: پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹، ص:۹۷

۱۷۔ احمد مشتاق، کلیات، ص:۴۳

۱۸۔ ایضا، ص:، ص: ۱۶۳

۱۹۔ میر تقی میر، کلیات میر (جلد اول) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶، ص:۱۵۸

۲۰۔ ایضا، ص:ص:۴۶۷

۲۱۔ احمد مشتاق، کلیات، ص:۱۲۳

۲۲۔ ایضا، ص:۱۵۷

۲۳۔ ایضا، ص:۱۳۷

۲۴۔ ایضا، ص:۱۴۹

۲۵۔ ایضا، ص:۹۳

۲۶۔ ایضا، ص:۱۳۹

۲۷۔ ایضا، ص:۱۴۸

۲۸۔ ضیا الحسن، ''احمد مشتاق: ایک مختلف رومانوی شاعر''، مشمولہ؛ آدمی ہمارا (شعریات احمد مشتاق)، مرتبہ؛ مشتاق احمد، ص:۱۱۶

۲۹۔ احمد مشتاق، کلیات، ص:۱۰۵

۳۰۔ ایضا، ص:۱۶۸